Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

A Study of Contemporary Sensibility in Modern Urdu Short Story

جدید اردو افسانے میں عصری حسیت: ایک مطالعہ

Dr. Nazia Sahar
Assistant Professor Department of Urdu Islamia College Peshawar
Dr. Parveen Kallu*
Associate Professor Urdu Department , Government College University Faisalabad. Corresponding Author
Email: drparveenkallu@gcuf.edu.pk
Syed Azwar Abbas
Lecturer Department of Urdu, Hazara University Mansehra

Abstract

Among the modernist writers who are important among the followers of the modern trend, the names of Surender Perkash, Ghiyas Ahmed Guddi, Balraj Menra, Ahmed Hamesh and Ratan Singh are prominent. The tradition of writing symbolic, allegorical and abstract stories was common among the followers of the modern trend. In fact, the stories written in the abstract style of writing depended on dialogues. The stories were completely devoid of plot, character, story, etc. The story written through dialogues became incoherent. In fact, the method of abstraction is a term in art painting in which some colors are scattered on the canvas through crooked lines. Which is related to the art of painting, but modern story writers started experimenting with this style in literature. During this period, the tradition of using unclear complex symbols also became common. Which had negative results. The understanding of the story became difficult for the reader, and the intense use of abstract style with symbols made Urdu story a mystery. The increasing complexities in life also found their place in literature. Now, instead of simple stories, the use of symbolic, allegorical, epic and mythological writing styles became common. Therefore, symbolic and allegorical stories in the narrative style are a reflection of their uniqueness.

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

Among these storytellers, the names of Ram Lal, Abid Sohail, Joe Ginder Pal, Ghiyas Ahmed Gaddi, Iqbal Majeed and Ratan Singh are prominently mentioned. In their writings, the causes of human discomfort, deprivation and suffering are social injustice, economic inequality, class exploitation and political oppression. In which there are new experiences, challenges and new services of life. The fabric of the new story is made of experiences and feelings instead of events and the organization of the plot is not only on the external level, but also the driving force of internal harmony is found in them.

Key Words: Contemporary Sensibility, Modern Urdu Short Story, Surender Perkash, Ghiyas Ahmed Guddi, Balraj Menra, Ahmed Hamesh, Ratan Singh, Symbolic, Allegorical, Abstract, Mystery

۱۹۲۰ء کے بعد جن افسانہ نگاروں نے اردو افسانے کی عظمت، وسعت اور وقار میں اپنے فکر و فن ،مطالعے، مشاہدے، احساسات و جذبات کے انسلاک سے قابل قدر اضافہ کیا۔ ان میں رام لعل کا نام بے حد اہم اور معتبر ہے۔ رام لعل ادب برائے زندگی و سماج کے قائل ہیں۔ ان کے افسانے سماجی حقیقت نگاری کی وصف سے آراستہ ہیں۔ رام لعل بسیار نویس ہیں۔ ان کے تقریبا سترہ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں" گلی گلی"، "آواز تو پہچانوں" ، "چراغوں کا سفر"،" کل کی باتیں" ،"انتظار کے قیدی" نئی دھرتی پرانے گیت"،"اکھڑے ہوئے لوگ"،" گزرتے ہوئے لمحوں کی چاپ"،"معصوم آنکھوں کا بھرم"اور "آئینے" اہم ہیں۔ اگر چہ ان کے افسانوں میں کوئی نیا تجربہ نہیں ملتا۔ بیشتر کہانیاں روایتی انداز میں زندگی کی الجھنوں کو سلجھانے میں لگی ہوئی ہیں۔ تاہم تقسیم ہند، ہجرت، فرقہ وارانہ فادات بعورت کی حالت زار، ان کی خوشیاں، نا آسودگیاں غرض کہ موضوعات کا ایک عریض سلسلہ ان کے افسانوں میں ملتا ہے۔ لہذا انھوں نے اپنے عہد کی ضرورتوں کے مطابق علامتی افسانے بھی لکھے ہیں لیکن ان میں پیچیدگی پیدا نہیں ہونے دی ۔ عصری سچائیاں ان کے افسانوں میں خاص موضوع رہی ہے۔ فادات سے متعلق ان کا افسانہ "ایک شہری" مشہور ہے۔ اس کے علاوہ "قبر "،"نصیب جلی" ، ایک اور پاکستانی اللہ کی بندی" ، "تین بوڑھے"،" نئی فصل کا ایک

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

ٹرک" ، "بھرے بازار میں"، "میں زندہ ہوں گا"، "گمشدہ زہر تھوڑا سا" وغیرہ بھی فادات ہجرت و تقسیم کی روداد مختلف زاویوں سے پیش کرنے میں کامیاب افسانے ہیں۔ لیکن ان افسانوں کو وہ شہرت نہ حاصل ہو سکی جو ان کا حق ہے۔

تقسیم اور فسادات سے کتنے رشتے اپنی معنویت و اہمیت سے عاری ہو جاتے ہیں۔ پیار و محبت کے رشتے کس طرح ٹوٹتے بکھرتے ہیں اس کی سچی تصویریں ہم کو مذکورہ افسانے میں مل جاتی ہیں۔ افسانے کا کردار بلدیو و سرسوتی ایک شادی شدہ جوڑے کی حیثیت سے خوشیوں بھری زندگی کی نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن تقسیم ہند، فسادات و ہجرت نے شادی شدہ جوڑے کو الگ کر دیا اور ایسے حالات پیدا کر دیے جہاں سرسوتی کی دوسری شادی اس کے والدین کے مشوروں سے عمل میں آتی ہے۔ اور ساتھ ہی افسانہ میں ایک Turming point آتا ہے۔ جہاں سرسوتی کا پہلا شوہر واپس آجاتا ہے لیکن سرسوتی اس کو قبول نہ کر سکی۔ کیوں کہ اب وہ کسی اور کی بیوی ہے۔ ذہنی کرب کی یہ کہانی اس دور کے مسائل و عکاس کی ترجمان ہیں۔

یہ کہانیاں تقسیم ہندوستان کی ہنگامہ خیزی اور خوں ریزی سے زیادہ سروکار نہیں رکھتی بلکہ ان حالات میں معاشرے کے اندرون میں پیدا شدہ ہیجان کا احساس دلاتی ہیں۔ بنتے بگڑتے رشتوں کے کرب کے بیان کے ساتھ خود افسانہ نگار کا کرب ان افسانوں میں شامل ہو گیا ہے اور یہی فنکارانہ صلاحیتوں کا ثبوت ہے۔

افسانہ "نئی دھرتی پرانے گیت میں" رام لیل نے جہاں ایک جانب ہجرت سے پیدا شدہ حالات نقل مکانی کی صعوبتوں کو پیش کیا ہے ساتھ ہی اس داخلی کرب کو بھی موثر انداز میں بیان کیا ہے جو اس کے سامنے کی یادوں کا عظیم سرمایہ ہے جس سے وہ بھی خود کو دور نہیں کر سکتا۔

سندر لال افسانے کا مرکزی کردار ہے۔ جس کو ہجرت کی مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ اپنا گھر بار چھوڑنے کا کرب اس کے سینے میں آج بھی ٹیس کی شکل میں موجود ہے۔ پڑوس میں رہنے والے ٹھاکر داس کے بیٹے کی شادی کے موقع پر ہونے والی رتجگا میں جب گانے کی آواز میں سندر لال کے کانوں میں پڑتی تو گانے کے بول اس کو ماضی کی ان میٹھی یادوں میں لے جاتے ہیں جس سے اس کی زندگی ہجرت سے قبل وابستہ تھی۔ اور حیران ہو کر سوچتا ہے کہ ہم اپنی

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

تہذیب کو نہیں، گھر بار وطن کو اپنے ساتھ لانے میں مجبور تھے لیکن یہ گیت سنگیت ہمارے اندرون میں محفوظ ہو کر ہمارے ساتھ ساتھ چلا آیا۔ اس نے دھرتی پر اور یہاں پر یہ ہماری پرانی تہذیب کتنے دنوں تک قائم رہ پائے گی۔ سب مٹ جائے گا اور یہ سوچ کر اس کا وجود کانپ کانپ جاتا ہے۔

رام لعل نے ہندوستانی سماج میں گیتوں کی اہمیت و معنویت پر زور دیا اور ان پر قوم کی پہچان کا ذمہ سونپ دیا ہے۔ اب یہ ہمارے تہذیبی اقدار خطرے میں ہیں۔ اس جانب اشارے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "گیت جو ایک قوم کی خاصیت تھے۔ گیت جو ایک قوم کا مزاج تھے۔ ایک خاص علاقے کی صدیوں کی روایت اور تہذیب و تمدن کے حامل تھے۔ سینکڑوں میل کا خاصہ اور دشوار گزار منزلوں کی صعوبتیں برداشت کر کے یہ گیت سینوں کے اندر محفوظ کر کے یہاں تک لے آئے گئے تھے۔ ان کے آبا واجداد کا اتنا بڑا سرمایہ ان کے ماں باپ کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ چراغ بجھ جائیں گے ایک ایک کر کے سارے چراغ۔"(1)

شہری زندگی اور اس کے اثرات پر رام لعل کا افسانہ "شیرازہ" بے حد اہم افسانہ ہے۔ ہندوستانی مشترکہ تہذیب کا خاتمہ، جاگیر دارانہ نظام کے خاتمے کی بعد بڑھتی ہوئی صنعتی ترقیات کے سبب شہروں میں روز بہ روز بڑھتی ہوئی آبادیاں ایک نئی تہذیب کی علمبردار ثابت ہوئیں۔ جس کے سبب مشترکہ خاندان کے بکھرے ہوئے شیرازے کو رام لعل نے اپنے افسانہ شیرازہ میں پیش کیا ہے۔ بدلتی ہوئی تہذیبی اقدار کے سلسلے میں رام محل کا بیان بے حد ضروری اور اہم ہے:

> "۱۹۶۰ء میں مجھے اپنے آس پاس کچھ نئی تبدیلیوں کا احساس ہوا۔ جیسے پرانی اقدار اب یکر ختم ہو چکی ہیں۔ جن نئی اقدار کا اب میں نے سہارا لے رکھا ہے وہ بھی اپنی جگہ سے اب

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

سرکے رہی ہیں۔ نیا ذہن گزشتہ دور کی ہر خوبصورت شئے کو
مٹاتا اور روندتا ہوا آگے بڑھ آیا ہے۔ اب وہ لوگ اپنا دو مینشن
چاہتے ہیں۔ ہر ایک تسلیم شدہ قدر کی مخالفت کرنا اپنا
دھرم سمجھتے ہیں۔"(2)

غرض کہ رام لعل نے جس زمانے میں افسانے لکھنے شروع کیے اس دور میں تلخ حقائق کو خارجی سطح پر نہیں بلکہ داخلی سطح پر پہنچ کر افسانہ لکھنے کا چلن تھا۔ اس کا اثر ان کے فکر و فن پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے افسانے میں عصری شعور اور عصری حسیت اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ موجود ہے اور یہ اسلوب کے تیکھے پن نے رام لعل کو اردو افسانہ نگاری کے فن میں امتیاز بخشا۔

جوگیندر پال کا شمار اس دور کے ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے جدید رجحان کے زیر اثر تجریدی و علامتی طریقہ کار پر اپنے افسانوں کی بنیادیں استوار کیں۔ ان کے بیشتر افسانے اسی طرز و فکر کے نمائندہ ہیں۔ اردو کے روایتی افسانوں سے علاحدہ ان کی ایک اپنی انفرادیت ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں سے خارجی حقیقت نگاری کو نظر انداز کر دیا اور انسانی شعور و لاشعور کی دنیا کو اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ جس میں ان کو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ دراصل جوگیندر پال کا دور جدیدیت کا دور تھا۔ اسی دور خاص کے تقاضوں کے مطابق انھوں نے بھی تجریدی افسانے لکھنے شروع کیے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا کیوں کہ جدیدیت کو زوال پذیر ہوتے دیکھ کر افسانہ نگاروں نے اپنی روش میں تبدیلیاں شروع کر دیں اور تجرید کے ٹیڑھے میڑھے راستوں سے پرہیز کرنے لگے۔ حالانکہ یہ بھی سچ ہے کہ اسی دور میں تجرید کو علامتوں سے ہم آہنگ کر کے اچھے افسانے بھی لکھے گئے۔ افسانہ نگار جوگیندر پال کے یہاں یہی صورتیں ملتی ہیں۔

اردو افسانے میں ساتویں دہائی کے افسانہ نگاروں کے فکر و فن کا جائزہ لیتے ہوئے محمد حسن نے جوگیندر پال کے افسانوں میں انھیں صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ جس کو وہ افسانوں کی چوتھی جہت سے معنون کرتے ہیں۔ چنانچہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"چوتھی جہت جوگیندر پال کی ہے۔ جنہیں سلوٹیں کے مصنف سے
زیادہ اور رسائی کے افسانہ نگار کی حیثیت سے کم پہچانا جائے گا۔

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

کیوں کہ رسائی کے افسانے خیالی پاروں سے بوجھل ہیں۔ علامت، تجرید اور ابہام سے ان پر کنکریٹ سے بنے ہوئے 'Pattern پیٹرن' کا شبہ ہوتا ہے۔ وہ متاثر نہیں کر پاتے۔ محض افسانہ نگار کی صلاحیتوں کے غماز ہیں۔ البتہ سلوٹیں میں جوگیندر پال کی افسانہ طرازی حقیقت کو نئے زاویوں سے گرفت میں لانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔"(3)

جوگندر پال کا فن تجرید کا فن ہے۔ جو کہ اسلوب و تکنیکی سطحوں پر ان کے متعدد افسانوں میں موجود ہیں۔ ان کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں" دھرتی کا لال"،" میں کیوں سوچوں"،" رسائی"،" مٹی کا اور اک"،" لیکن بے محاورہ"،" بے ارادہ سلوٹیں"، وغیرہ ہیں۔ ان مجموعوں میں سلوٹیں، مٹی کا اور اک کو زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان میں روایتی اور علامتی طریقہ کار کے امتزاج سے ایک نئے اور بلیغ اسلوب کا استعمال جوگندر پال کے فکر و فن کی پختگی کا ضامن ہے۔ اپنے افسانہ نگاری میں ہونے والے نئے نئے تجربات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" موجودہ زندگی میں فنازم کی نت نئی تبدیلیوں کی خواہش بڑی نیچرل ہے۔ یہ غلط نہیں کہ ہماری شکلیں ویسی ہی ہیں جو سیکڑوں برس پہلے کے لوگوں کی تھیں۔ وقت کی مزید طوالتوں کے مطالعہ سے ان اشکال کا تغیر بھی غیر واضح نہیں لیکن یہ بھی درست ہے کہ ہر دور کے انسان کی پہچان اس کے باپ کی پہچان سے مختلف ہے، اپنے اظہار کی اس تبدیلی کے بغیر وہ اپنی شخصیت کو ادا کرنے سے قاصر ہے۔ نئی بیتیں دراصل نئے انسان کی بدلتی ہوئی سوچوں کی بھی نشاندہی کرتی ہیں۔ اس لیے مختلف ادوار کی کہانیوں کی ایک سی دستار بندی کر کے ہم انہیں بے سبب متنازعہ فیہ بنا دیتے ہیں۔" (4)

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

جوگیندر پال کا افسانہ "بو" سیاسی بدعنوانیوں، انسانی بے حسی پر زبردست طنز کرتا ہے۔ یہ افسانہ بیانیہ کی بہترین مثال ہے۔ جس میں علامتوں کے امتزاج سے افسانہ کی معنویت میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ "بو" علامت ہے سرکاری اداروں میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کی، گویا سرکاری نظام میں اس قدر کرپشن بڑھ چکا ہے کہ مردے بھی اب ان سے محفوظ نہیں ہیں۔ جوگندر پال نے اس افسانے میں ڈاکٹر سروپ اور چپراسی چرنجی کے ذریعہ بدنظمی کا شکار ہوئے سرکاری اداروں، سرکاری اہل کاروں کی بے حسی، بدنیتی کا تمام ماجرا علامتی و استعاراتی انداز میں پیش کر دیا ہے۔ محض چند جملوں کے ذریعہ پورے افسانے کا تانا بانا آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے:

"آج کل سبھی اپنے دھرم ایمان کو بیچے ہوئے ہیں۔"

ڈاکٹر سروپ اپنے غصے پر قابو پانے کے لیے سگریٹ سلگانے لگا۔ کیا زمانہ آگیا ہے بھائی اپنے بھائی کو نہیں پہچان سکتا۔"

سوچ سوچ کر کیا بنے ہوئے ہو۔ کیا تمہیں اپنے آپ سے بو نہیں آتی یہاں سب کچھ آپ ہی آپ چلے تو چلے۔ تم سب لوگ نااہل ہو۔"

اگر میں تمہاری حفاظت نہ کروں تو تم سبھو کو دو دن میں جوتے مار مار کے یہاں سے نکال دیا جائے۔"

یہ تمام جملے سرکاری دفتروں میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کے بہترین مثالیں ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کی جانب بھی واضح اشارہ ہے کہ ہم سب کچھ جانتے ہوئے بھی انجان بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ بو دھیرے دھیرے ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ جب ڈاکٹر سروپ کا تبادلہ ان کی نااہلی کے باعث مردہ خانے کے انچارج کی صورت میں ہوتا ہے تو اس کو بہت مایوسی ہوتی ہے۔ لیکن اس کا ساتھی سرکاری ملازمت میں پائی جانے والی سہولتوں کی یاد دہانی کراتے ہوئے خود اپنی پول کھولتا ہے۔

"دل چھوٹا مت کرو ڈاکٹر.... سرکاری ڈاکٹر یہاں ہو، یا وہاں، ایک ہی بات ہے۔ وہاں وہ مریض کو موت کی راہ پر ڈالتا ہے اور یہاں مریض اس راہ پر چلتے ہوئے اس کے پاس آپہنچتا ہے۔

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

اس نے ہنستے ہوئے ڈاکٹر شروپ کی پیٹھ تھپکی تھی۔ "بڑے آرام دہ ٹھکانے پر آ لگے ہو۔ اب چین کی بانسری بجاؤ۔"

لہذا افسانہ بوسیاسی، سماجی حقیقت نگاری کی بہترین مثال ہے۔ افسانہ نگار جوگندر پال کا فکر و فن اپنی تمام تر لوازمات کے ساتھ مذکورہ افسانے میں موجود ہے۔ یہ قول محمد حسن:

> "بیچ کے دور میں باطنیت کی مہمل گہرائیاں ناپنے کے بعد جوگندر پال نے ایک بار پھر اس راز کو پالیا ہے کہ فن کاری زندگی میں شرکت اور شمولیت میں ہے۔ زندگی سے کنارہ کش ہو کر فلسفہ طرازی میں نہیں۔"(5)

اس دور کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم اور سنجیدہ نام عابد سہیل کا ہے۔ عابد سہیل کے افسانے بھی زندگی کی شمولیت اور شرکت سے پروان چڑھے۔ لہذا انھوں نے اپنے افسانے میں معاشرے کے اہم ترین مسائل کو بڑی باریکی سے پیش کیا ہے۔ انسان کی مجبوریاں، ناکامیاں محرومیاں، بے بسی، بے کسی نیز مستقبل کی جدوجہد اور زندگی کی تلخ سے تلخ حقیقتوں کو انھوں نے افسانوی قالب میں بڑی ہنرمندی سے سے ڈھال دیا ہے۔

عابد سہیل کا پہلا افسانوی مجموعہ "سب سے چھوٹا غم" ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے ہمراہ ان کی معاشرتی بصیرتوں نیز داخلی و خارجی سطح پر انسانی جذبات و احساسات کا کامیاب تجزیہ ہے۔ اس مجموعے میں سولہ افسانے شامل ہیں۔ جس میں افسانہ "سب سے چھوٹا غم" کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی۔ مذکورہ افسانے کا مرکزی کردار ایک ایسی عورت ہے جس کا شوہر شرابی ہے۔ اور وہ اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا غم تصور کرتی ہے۔ اپنے غم کو دور کرنے کی غرض سے وہ درگاہ شیخ سلیم چشتی پر حاضر ہوتی ہے۔ جہاں روضے کی جالیوں پر بندھے بے شمار دھاگوں پر اس کی نظریں پڑتی ہیں۔ ساتھ ہی وہاں پر موجود لوگوں کے دکھ درد سے بھری آہ وزاری سن کر اس کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ وہ ابھی تک غلط نہی میں جی رہی تھی۔ اصلا میرا غم تو ان تمام لوگوں کے مقابلے میں سب سے چھوٹا ہے۔ افسانہ نگار کی قلم سے نکلے درج ذیل یہ چند جملے مرکزی کردار کے احساس و جذبات کی سچی نمائندگی کرتے ہیں:

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

"ہر جگہ ایک دو نہیں درجنوں دھاگے بندھے ہوئے اپنی آرزوؤں کی تکمیل کے لیے آنسو بہا رہے تھے۔ آنسوؤں کے اس سیلاب میں اس کے ایک قطرہ کی بھلا کیا اہمیت۔ گہرے زخم نغم واندوہ کے پہاڑ اور مصائب کے طوفان خیز دھارے جن کی یہ دھاگے علامت تھے اسے اپنے غم کے مقابلے میں بے حد بڑے اور عظیم معلوم ہوتے ہیں۔" (6)

آنسوؤں کے اس سیلاب میں اس کے ایک قطرے کی بھلا کیا اہمیت یہاں پر افسانہ نگار کا فن اپنے عروج پر ہے۔ وہ کسی فرد واحد سے متاثر نہیں ہے۔ بلکہ پورا معاشرہ اور اس کے معاشرے میں لاکھوں لوگوں کے مصائب تکالیف سے ایک حساس دل کس حد تک دکھی ہو سکتا ہے کی بہترین مثال ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان کو اپنا ہی غم بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اگر وہ دوسرے کے جذبات کے متعلق سوچنا شروع کر دے تو اس کی کوشش سے لاتعد ادلوگوں کو خوش رہنے کے اسباب میتر ہو جائیں گے۔ اس مجموعے میں تقریباً تمام افسانے انسانی دردمندی کے غماز ہیں۔ افسانہ " نوحہ گر " میں عابد سہیل نے موجودہ دور کے اہم مسئلے بے روزگاری کو پیش کیا ہے۔ "نیا سفر "انسانی بے حسی کا افسانہ ہے۔ جس میں وہ انسانوں کی خود داری پر چوٹ کرتے ہیں۔ عابد سہیل کی فنکارانہ صلاحیتوں کے متعلق قیصر تمکین اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"عابد سہیل کے پاس اگر کوئی نئی بات کہنے کو نہ ہو تو وہ نہیں لکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کہانیاں نسبتاً کم لکھیں۔ لیکن جو بھی لکھیں ان میں انھوں نے اپنے درد کی بھرپور عکاسی کے علاوہ انتہائی خفیف طریقے پر ایک امید افزا اشارہ بھی کیا ہے۔ ان کی کوئی کہانی محض کہانی کی صنف میں نہیں آتی۔ بلکہ اس کے بین السطور میں ہمیشہ ان کا واضح شعور جھلکتا رہتا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کہانی دنیا سفر غالباً ہماری اچھی کہانیوں میں گئی جائے گی۔" (7)

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

عابد سہیل کا دوسرا افسانوی مجموعہ "جینے والے ۱۹۹۸" ء میں شائع ہوا۔ اور تیسرا مجموعہ "غلام گردش" کے نام سے ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ جیسا کہ قیصر تمکین نے اشارہ کر ہی دیا کہ اگر کوئی نئی بات کہنے کو نہ ہو تو وہ نہیں لکھیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کہانیاں نسبتاً کم لکھیں۔ لہذا اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو کے افسانوی ادب پر تنقید و مباحث کرنے والے عابد سہیل نے افسانہ نگاری کو اپنی سنجیدہ شخصیت کی ہی طرح نہایت سنجیدگی سے برتا ہے۔ سوا نیزے پر سورج، جینے والے، شرطیں، سگ گزیدہ مردم گزیدہ غیر معمولی افسانے ہیں۔ ان افسانوں میں ان کا فکر و فن بام عروج پر ہے۔ غرض کہ سب سے چھوٹا غم سے لے کر غلام گردش تک عابد سہیل کی کہانیاں زندگی کے تلخ حقائق کی ترجمان ہیں۔ عابد سہیل کے فکر و فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے افسانہ نگار رتن سنگھ لکھتے ہیں:

> "عابد سہیل اس بیسویں صدی کی پگڈنڈی پر اپنا پتھر کا جسم لے کر کچھ اس طرح چل رہا ہے کہ تیز و تند آندھیوں کی زد میں آ کر راستے کانپ جائیں تو جائیں، قہر آلود آسمان کو دیکھ کر دھرتی کا سینہ ممکن ہے لرز جائے لیکن سخت سے سخت حالات میں اس کی اکڑی ہوئی گردن میں خم نہیں آتا۔ صلیب پر لٹکے ہوئے عیسی کے چہرے سے جو نور ٹپکتا ہے، اس کی ایک جھلک، حالات کی سولی پر لٹکے ہوئے عابد سہیل کے چہرے پر میں نے اکثر دیکھی ہے۔ عابد کی کہانیاں ان درد بھرے سونے لمحوں کی روداد ہیں جن میں اس کا پتھر کا وجود پگھل کر اس کی آنکھوں سے آنسو بن کر ٹپکتا ہے۔"(8)

بیسویں صدی کی پگڈنڈی پر چلنے والے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام اقبال مجید کا ہے۔ اقبال مجید نے چھٹی دہائی میں افسانے لکھنے شروع کیے۔ ان کو مقبولیت افسانہ "دو بھیگے ہوئے لوگ" کی تخلیق کے بعد سے ملنی شروع ہو گئی۔ پھر انھوں نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ اقبال مجید کا افسانوی فن علامتی اور اسعاراتی انداز میں انسانی داخلی و خارجی احساسات و جذبات کی عکاسی کا فن ہے۔ جہاں ان کا اسلوب بیانیہ کی روایت سے انحراف نہ کرتے ہوئے اس

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

سے بھرپور استفادہ کرتے ہیں۔ ان کے افسانے علامتی ہونے کے باوجود عام فہم ہیں۔ ساتھ ہی بیانیہ میں کسی طرح کی پیچیدگی کا گمان نہیں گزرتا۔ گویا فکر و فن کے ساتھ روایتی انداز تحریر کا امتزاج اقبال مجید کی انفرادیت کا مظہر ہے۔ اقبال مجید کی افسانہ نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے عابد سہیل رقم طراز ہیں:

> "زبان کے روایتی استعمال اور علامت کی آمیزش اور کہیں کہیں آویزش سے انھوں نے اردو افسانے کو نئی وسعتوں سے روشناس کرایا ہے۔ اقبال مجید اظہار کے لیے علامت کا سہارا تو ضرور لیتے ہیں۔ لیکن ان کی علامتیں لسانی نہیں فکری ہوتی ہیں۔ جن سے پورا افسانہ ایک علامتی پیکر اختیار کر لیتا ہے۔ (9)"

اقبال مجید کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ دو بھیگے ہوئے لوگ، ایک حلفیہ بیان (۱۹۸۵ء) اور شہر بدنصیب (۱۹۹۷ء) ان مجموعوں میں شامل تمام افسانے اقبال مجید کی فنکارانہ صلاحیتوں کے غماز ہیں۔

ان کا مشہور افسانہ دو بھیگے ہوئے لوگ ایسے دو انسانوں پر مشتمل ہے جو اتفاق سے بارش ہونے پر بارش کی وجہ سے اور کوئی بہتر ٹھکانہ نہ ملنے کی صورت میں ایک ایسے سائبان کے نیچے کھڑے ہو جاتے ہیں جس کی چھت سے بھی پانی ٹپک رہا ہے۔ ایسے حالات میں ایک کردار خود کو بارش کے حوالے کر دیتا ہے۔ جبکہ دوسرا ٹپکتے ہوئے سائبان کے نیچے خود کو بھیگنے سے بچانے کی ناکام کوشش میں منہمک ہے۔ یہاں قاری کا استعجاب اپنے عروج پر ہو جاتا ہے کہ جب بھیگنا مقصود ہے تو ٹپکتے سائبان کا جھوٹا سہارا کیوں؟ اقبال مجید نے علامتی انداز میں دونوں کردار کی ذہنی کیفیات کو پیش کیا ہے کہ وہ کون سی وجہ ہے جس کے سبب دوسرے آدمی کو سائبان کے نیچے بھیگنا زیادہ مناسب معلوم ہو رہا ہے۔ یہی بات قاری کے ذہن کو حیرت و استعجاب کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ افسانے کا پہلا کردار جو کہ کھلے آسمان کے نیچے خود کو بارش میں آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ یہ کیفیت اس کے ذہن میں ایک سوال کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

"میں سمجھتا تھا کہ میرے اور اس کے درمیان بہت کچھ مشترک تھا۔ سفر کا ارادہ، یک بارگی بارش میں پھنس جانا، ایک ایسی چھت کے نیچے سر چھپانا جس کی رگ رگ چھدی ہوئی تھی اور پھر ایک ہی کیفیت میں لگاتار دونوں کی سوچ بھی مشترک ہوگی لیکن وہ ایسی حماقت انگیز حرکتیں کر رہا تھا جس کا کوئی جواز میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔" (10)

بارش کے رک جانے کے بعد پہلا کردار اپنی پہنی الجھنوں کو رفع کرنے کی غرض سے اور اس جواز کی تلاش میں دوسرے کردار کے پاس جاتا ہے۔ جو کہ ایک چائے کی ہوٹل پر چائے پینے کو کھڑا ہوا ہے۔ چائے پینے کے دوران وہ دوسرے آدمی سے کچھ بے تکے سوال کرتا ہے:

"کپڑوں کے علاوہ اس وقت کیا کوئی اور چیز ہے؟ آگے کہتا ہے میرا مطلب ہے جیسے روپے پیسے کوئی نوٹ؟"

حیرت و استعجاب اپنے عروج پر ہے۔ کیوں کہ پہلے کردار کے پاس کوئی ایسا اہم سامان نہیں ہے جنھیں وہ بھیگنے سے بچانا چاہتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود کچھ تو ہے اور وہ کیا ہے؟

"آپ کے پاس جوتے قمیض، پتلون، ریزگاری کے علاوہ کوئی چیز نہیں لیکن میرے پاس ہے۔ آپ کے لیے اگر جوتے اور قمیض اور پتلون اور ریز گاری بھیگ بھی جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن میں جوتے، پتلون اور قمیض کے بھیگ جانے پر بھی اس چیز کو بھیگ جانے سے بچانا چاہتا ہوں۔"

یہاں پر کہانی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن پوری کہانی میں کہیں بھی افسانہ نگار نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ کون سی چیز تھی جس کو دوسرا کردار اتنا اہم تصور کرتا ہے۔ لیکن قاری کے لیے اس میں جو اشارے ہوئے ہیں وہ کافی ہیں۔ یہ سمجھنے کے لیے کہ اس کہانی کے ذریعے افسانہ نگار ان تہذیبی اقدار کی حفاظت کرنا چاہتا ہے جو بدلتے دور کی تیز بارش میں ٹوٹ کر بکھر سکتی ہے۔ جبکہ دور حاضر ان تہذیبی اقدار کی اہمیت و معنویت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ بدلتے ہوئے حالات نے انسانی شعور کو کس حد تک نقصان پہنچایا ہے کہ وہ اپنی ہی بنیادوں سے یکسر خود

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

کو کاتا جارہا ہے۔ جبکہ وہ اس حقیقت سے نا آشنا ہے کہ جب بنیادیں ہی نہ بچیں گیں تو خود اس کا وجود بے جڑ کے پودے کی مانند خلا میں حالات کی آندھیوں کی زد کا شکار ہوتا رہے گا۔ مجموعہ دو بھیگے ہوئے لوگ کے افسانوں میں بیساکھی، مدافعت، پرانہ المیہ اور پوشاک بھی اہم افسانے ہیں۔ اقبال مجید کے افسانوں میں موضوعاتی ندرت کے ساتھ اسلوب میں بھی تنوع ملتا ہے۔ ان کے افسانوں کے اسلوب میں یکسانیت ملنا مشکل ہوتا ہے۔ بیشتر افسانوں میں جداگانہ اسلوب کی کارفرمائی موجود ہے۔ پروفیسر محمد حسن اپنے ایک مضمون افسانوی ادب میں علامتی اظہار میں ایسے ہی افسانوں کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ”دور حاضر میں علامتی اظہار کا چرچہ ذرا دوسرے ڈھنگ سے ہوا ہے۔ مضامین اور افسانوں میں ہمارے لکھنے والوں نے اس طرز کو اپنے ڈھنگ سے برتا ہے. یہاں علامتوں کی تفریح وجہی اور آزاد کی طرف صاف اور واضح نہیں۔ پڑھنے والے کو خود اپنے ذہن پر بھی ذرا زور ڈالنا پڑتا ہے۔ جو افسانے کے لطف میں مزید اضافہ کرتا ہے۔ افسانے میں اس روایت کو اقبال مجید نے آگے بڑھایا ہے اور علامتی پیرائے اظہار کو نئی توانائی اور معنویت عطا کردی۔“(11)

علامتی پیرائے اظہار کی یہ نئی توانائی اور معنویت ہمیں اقبال مجید کے دوسرے افسانوی مجموعوں میں ایک حلفیہ بیان اور شہر بدنصیب میں بھی ملتی ہے۔ عصری حسیت سے مملو اقبال مجید کے افسانے ان کے فکر و فن کی نمائندہ مثالیں ہیں۔ جن میں افسانہ زندگی کی تمام گرہیں کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ زندگی میں پیش آنے والے حالات انسانی اندرون کو کس حد تک متاثر کرتے ہیں۔ ان داخلی و خارجی احساسات کا علامتی، استعاراتی اظہار اقبال مجید کے افسانوں کا اہم جزو ہے۔ ان کے افسانوں کے کردار ہماری روز مرہ کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس میں کچھ بے روزگار بھی ہیں، کچھ خیالی دنیا میں جینے والے لاابالی لوگ، تو کچھ مدافعت کی تلاش میں سرگرداں تو کچھ خود غرضی کی علامت بنے انسانوں کو کچلنے میں مصروف ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ یہ افسانے اقبال مجید کی اب تک کی زندگی میں پیش آنے

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

والے تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہیں۔ ان کے افسانے قدیم افسانوی روایات سے بغاوت نہیں کرتے اور نہ ہی جدیدیت کی تجریدیت کو گلے لگاتے ہیں۔ بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے ایک منفرد دنیا آباد کرتے ہیں۔ بقول مہدی جعفر:

> "اقبال مجید اپنے افسانوں کے لہجے میں پختگی اور طمانیت کی نمایاں پہچان قائم کرتے ہیں۔ پرانی قدروں اور اور عصری حسیت کے تعمیل میں قدیم اسلوب استعمال ہوتا ہے اور اس میں بڑی خود اعتمادی جھلکتی ہے۔ جہاں تک انسانی حسیت کا تعلق ہے اس کے اظہار میں پرانے اسلوب کا استعمال بڑی محنت کا طلب گار ہوتا ہے۔ امنڈتے ہوئے عصری دھاروں کو ایسے اسلوب میں ڈھالنے کے لیے جس کوشش اور جانفشانی کی ضرورت ہے اسے اقبال مجید جیا پختہ فن کار ہی محسوس کر سکتا ہے۔ عصری حسیت کے تانے بانے بننا دشوار گزار مرحلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اقبال مجید کے حالیہ افسانوں کو ایک نئی کروٹ سے تعبیر کیا ہے۔"(12)

ساتویں دہائی میں اردو افسانے میں چند نئی توانا اور تحیر آمیز آواز میں ابھریں۔ جنھیں ناقد و ادیب محمد حسن نے تیسری آواز سے تعبیر کیا تھا ان میں افسانہ نگار رتن سنگھ کا نام نمایاں ہے۔ رتن سنگھ اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں اقبال مجید، عابد سہیل، رام لعل، جوگندر پال، اقبال متین وغیرہ میں اپنے مخصوص اختصار پسند مزاج کے لیے مقبول ہوئے۔ رتن سنگھ نے اپنے پیش روؤں اور ہم عصروں میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کی غرض سے اپنی راہ الگ بنائی اور چھوٹے چھوٹے علامتی و استعاراتی پیرائے اظہار میں افسانے تخلیق کیے۔ رتن سنگھ نے اپنا پہلا افسانہ ۱۹۵۲ء میں لکھا جو کہ رسالہ راہی ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا اور یہیں سے رتن سنگھ کی ادبی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اگر چہ افسانے لکھنے سے پہلے وہ پنجابی میں نظمیں لکھا کرتے تھے اور ان کی نظمیں باقاعدہ ہندی و پنجابی رسالوں میں باقاعدگی سے شائع ہوتی تھیں۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان ہجرت کے کرب میں مبتلا تھا اور رتن سنگھ کی زندگی بھی ان حالات سے

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

دو چار تھی ۔ ہجرت کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے انہوں نے افسانہ نگاری کی ابتداء کی۔ دراصل رتن نگھ افسانہ نگار رام لعل کی تحریک پر اردو افسانہ کی جانب متوجہ ہوئے اور افسانہ نگاری کو مستقل طور سے اپنا شعار بنالیا۔ رتن سنگھ کے اب تک متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں پہلی آواز ۱۹۶۹ء، پنجرے کا آدمی ۱۹۷۳ء کاٹھ کا گھوڑ ۱۹۹۳ء، پناہ گاہ ۲۰۰۰ء، پانی پے لکھا نام ۲۰۰۸ء اہمیت کے حامل ہیں۔ رتن سنگھ کے افسانوں کا مرکز و محور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی وہ وسیع دنیا ہے جس میں زندگی گزارنے والے انسان نہ جانے کتنے مسائل و مشکلات سے روز بروز گزرتے ہیں۔ خوشی و غم کی آمد و رفت کا یہ سلسلہ ازل سے جاری و ساری ہے۔ جس میں انسانی وجود کا عمل دخل برائے نام ہے۔ کیوں کہ یہ سارا نظام خدائی نظام ہے۔ اور ہم اس کی مصلحتوں کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خود رتن سنگھ بھی اس نظریہ کے پیروکار ہیں۔ ان کے مطابق خدا سب سے بڑا کہانی کار ہے۔ جس نے اپنی مخلوق کو کردار کی شکل میں دنیا میں بھیج کر اپنی کہانی کی تخلیق زندگی میں پیش ہونے والے واقعات سے کی ہے:

> ”کہانی میں اس حد تک ایمان رکھتا ہوں کہ میرے نزدیک خدا سب سے بڑا کہانی کار ہے۔ اس کی تخلیق کردہ کائنات کے پس منظر میں اس کی مخلوق اس کے کردار ہیں، آتے جاتے موسموں میں کے واقعات اس کی کہانی کو تسلسل بخش رہے ہیں۔ اور یہ تحیر ایسا ہے کہ اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہنے والے انسان کو خدائی قدرت کی ذرا سی رمز بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ بس دیکھ رہا ہے اور حیران ہو رہا ہے۔“(13)

رتن سنگھ کے افسانے عصری حسیت کے حامل ہیں۔ ان کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے یہاں بھی یہ رجحان موجود ہے۔ ساتویں دہائی کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں اقبال مجید، عابد سہیل، جوگندر پال وغیرہ بھی قدیم روایت سے منحرف ہوئے جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے۔ جدید رجحان کے زیر اثر علامتی تمثیلی افسانے لکھتے رہے۔ یہ سلسلہ بدستور اب بھی جاری ہے۔ چنانچہ رتن سنگھ کے افسانوں میں بھی تجریدیت کی لایعنی فضا نہیں بلکہ معاشرتی حقیقت

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

نگاری کا رنگ غالب ہے۔ اپنے مخصوص اختصار پسند رویے کے ساتھ انھوں نے علامتوں کا استعمال بغیر کسی گھماؤ یا الجھن کے براہ راست کیا ہے۔ اس اختصار کو انہوں نے اپنی انفرادیت قرار دیا ہے۔ گویا اپنے خیال کو کردار و علامت کے ذریعہ نہایت مدھم انداز میں براہ راست بیان کر دینا ہی ان کے فکر و فن کو امتیاز بخشتا ہے۔ اپنے فکر و فن پر اظہار خیال کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> "جب میں نے لکھنا شروع کیا اس وقت ہمارے سامنے بیدی، کرشن چندر، منٹو، قرۃ العین حیدر یہ سب لوگ کہانی کو اس حد تک آگے بڑھا چکے تھے کہ اردو افسانہ عالمی معیار کو چھو رہا تھا۔ جنہوں نے کرشن چندر، منٹو بننے کی کوشش کی وہ کھو گئے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے اس سلسلے میں اختصار کا سہارا لیا۔ عام طور پر کہا بھی جاتا ہے کہ رتن سنگھ کا فن اختصار سے ہے۔ اس اختصار میں بہت سی خامیاں بھی ہیں۔ تھوڑے سے لفظوں میں اپنی بات کو کہنا بہت مشکل بات ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اپنے لیے بہت مشکل راستہ چنا۔ اختصار کو علامت کے طور پر استعمال شب و روز ہونے والی زندگی کیا۔ جو بات مجھے دوسروں سے الگ کرتی ہے وہ ہے فکری گہرائی۔ میرے یہاں کہانیاں کسی خیال کو مکمل طور پر کہنے کے لیے کہانی کا تانا بانا بنا گیا ہو۔ جس دور سے ہم گزر رہے ہیں وہ ایک ایسا دور ہے جہاں فن کار کے لیے خود اپنے وقت کا صحیح طور پر عکاس بننے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے۔" (ایک انٹرویو)

یہ ہمت رتن سنگھ کی افسانہ نگاری کا خاص وصف ہے۔ عصری حالات و مسائل پر لکھے ان کے متعدد افسانے ان کے گہرے سیاسی، سماجی، معاشی شعور کے غماز ہیں۔ رتن سنگھ نے ان واقعات و حادثات کو بھی اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ جنھیں ہمارے بعض قلم کاروں نے قابل

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

اعتنا نہیں سمجھا۔ وہ سادہ زبان اور چھوٹے چھوٹے جملوں کے ذریعے چونکا دینے والی باتیں کرنے کے ہنر سے واقف ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں سچائی کے ساتھ تجسس اور دلچسپی کا عنصر شروع سے آخر تک قائم رہتا ہے۔ ان کے افسانے کینوس کے اعتبار سے مختصر ہونے کے باوجود معنویت اور بصیرت سے بھرپور ہیں۔ ان کی ہر کہانی ایک خاص مقصد کی حامل ہوتی ہے اور وہ مقصد ہے انسان دوستی اور دردمندی کا، جس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ رتن سنگھ کے بیشتر افسانوں میں انسان دوستی اور دردمندی کے جذبے کی کارفرمائی موجود ہے۔

رتن سنگھ کا افسانہ " پہلی آواز میں ان کی یہ دردمندی افسانے کے مرکزی کردار منا " سے ہمدردی کی صورت میں ابھرتی ہیں۔ منا جو یتیم و بے سہارا ہے۔ اسٹیشن پر دوسروں کے جھوٹن چاٹ کر زندگی کی گاڑی کھینچ رہا ہے۔ ایسے میں اس کی زندگی میں ایک موڑ آتا ہے جہاں وہ گھانس کی ٹی پر پانی ڈالنے کے کام پر بطور ملازم لگا دیا جاتا ہے۔ منا جو احساس آدمیت سے بے نیاز تھا اور حیوانوں کی طرح زندگی گزارنے پر مجبور تھا۔ اس کی زندگی میں تغیر اس وقت آتا ہے جب اس کو اپنی پہلی تنخواہ دس روپے کی صورت میں ملتی ہے۔ اس موقع پر ایک سپاہی کی زبان سے نکلے چند جملے اس کے لیے پہلی آواز بن جاتے ہیں۔ وہ آواز جو اس کی حیوانی بے حسی کو احساس دلاتی ہے کہ وہ اب ان پیسوں سے جو اس کے ہیں اس کی محنت کے ہیں۔ اس کا استعمال وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے کر سکتا ہے۔

اس افسانے میں منا علامت ہے ان ہزاروں بے قصور بچوں کی استحصال زدہ بے حس زندگی کا جہاں وہ دوسروں کی گالیوں پر زندہ رہنے کے لیے مجبور ہے۔ بھوک اور افلاس کے تار و پود سے بنا رتن سنگھ کا افسانہ ہزاروں سال لمبی رات اپنے علامتی و استعاراتی پیشکش اور فکری گہرائی و گیرائی کے بابت اردو کے افسانوی ادب میں اہمیت کا حامل ہے۔ افسانے کی ابتداء ہم کو داستانوی عہد کی یاد دلاتی ہے۔ جہاں چند لوگ اکٹھا ہو کر ایک دوسرے سے کہانی سنانے کی بات کرتے ہیں۔ جس سے کہ ہزاروں سالوں سے لمبی بھوکی رات ایک بار پھر بیت جائے۔ رتن سنگھ نے نہایت عمدگی سے اس افسانے کا تانا بانا بنا۔ ان کا مرکزی خیال صدیوں سے چلی

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

آر ہی غریبی و مفلسی کی داستان ہے۔ مذکورہ افسانے میں چند بھوکے پیٹ بھر کھانا کھانے کے تصور میں ڈوبے اپنی زندگی کی راتیں گزارنے پر مجبور ہیں۔

در اصل رتن سنگھ خود ایک دردمند دل کے مالک ہیں۔ انسانی بہتری و خوشحالی کا عظیم جذبہ ان کے اندر رواں دواں ہے۔ لہذا ان کے افسانے ان کی داخلی و خارجی کیفیت کے ترجمان ہیں۔ جہاں حقیقت پسندی بھی ہے تخیل کی کارسازی بھی ہے۔ ان کے بعض افسانوں میں شعور کی رو' کی تکنیک کا استعمال ضرور ہے جو ان کی ذہنی نشیب و فراز کا غماز ہے۔ پروفیسر احتشام حسین نے ۱۹۶۱ء میں لکھے اپنے ایک مضمون میں نئے افسانہ نگاروں کے متعلق لکھا تھا کہ:

> "نئے افسانہ نگاروں کے لیے یہ معاملہ زبردست آزمائش کا ہے۔ ان کو فن اور مواد دونوں کے نقطہ نظر سے اپنے کو نیا ثابت کرنا ہے۔ یعنی محض کسی کا مقلد یا نقال نہیں بنتا ہے بلکہ اپنی انفرادیت سے ایک نیا معیار قائم کرنا ہے۔ انھوں نے بیان و اظہار کے جو طریقے اختیار کیے ہیں وہ کسی حد تک منفرد ہیں۔" (14)

الغرض رتن سنگھ کے یہاں یہ خوبی موجود ہے اور انھوں نے اپنی انفرادیت کو معاصر افسانہ نگاروں میں برقرار رکھا۔ جس کی روشن مثالیں ان کے متعدد افسانے "من کا طوطا، پنجرے کا آدمی، نافے کا درد، کاٹھ کا گھوڑا، سوکھی ٹہنیوں پر اٹکا ہوا سورج، ذرے، ڈری ڈری ہوا، پناہ گاہ بیسویں صدی کا صدر بازار، پانی پر لکھا نام وغیرہ ہیں۔ ان افسانوں میں عصری، سماجی، معاشی، سیاسی مسائل کی ترجمانی موجود ہے۔ سماجی تانے بانے میں الجھی ہوئی انسانی زندگی معاشی بدحالی و سیاسی بدعنوانیوں کے مکڑجال میں پھنسی اپنی بے بسی کی داستان سنانے میں مصروف ہے۔ لہذا رتن سنگھ کا افسانہ زندگی کے رموز کو سمجھنے میں نہایت سنجیدگی سے منہمک ہے۔ ان کے نزدیک حیات انسانی اور ان سے منسلک تمام حرکات و سکنات کے راز کو سمجھنا ان کے افسانے کی انتہا ہے۔ چرند، پرند، قدرتی مناظر، پیڑ پودے، پہاڑ، ندیاں غرض کہ حیات انسانی کے ساتھ تمام کائنات ان کے افسانوں کے موضوعات ہیں۔ جس کی بنیادیں انسانیت کے عالمی پیغام سے وابستہ ہیں۔ ان کی فکر و نظر انسان اور انسانیت کو بنیادی موضوع قرار دیتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

"میرے خیال میں افسانہ نگاری کا ایک ہی Commitment ہے اور وہ ہے، زندگی کے رموز کو سمجھنا اور اسے خوبصورت بنانے میں مددگار ثابت ہونا۔"

آگے لکھتے ہیں:

"افسانہ نگار کا تعلق زندگی اور زندگی پر اثر انداز ہونے والے تمام عناصر سے ہے۔ اس لیے حدود کی باتیں کرتے ہوئے یہ کہنے میں کوئی بھی مجھک نہیں کہ اگر واقعی خدا کی وجہ سے ہی زندگی وجود میں آئی ہے تو زندگی کے بھید کو سمجھنے کے لیے افسانہ نگار کے لیے خدا بھی ایک کردار ہے۔" (15)

رتن سنگھ کے خیال میں خدا ایک کہانی کار ہے۔ وہ اپنی کہانیوں میں خود ایک کردار کی بھی حیثیت رکھتا ہے۔ گویا زندگی کے راز کو جاننے کے لیے ہماری رسائی خدا تک ہونی چاہیے۔ غالباً خدا تک رسائی حاصل کرنا ہی رتن سنگھ کی افسانہ نگاری کا نصب العین ہے۔ خدا تک رسائی تب ہی ممکن ہے جب ہم خلق خدا سے محبت کریں۔ اس کے دکھ درد کو مٹانے ختم کرنے کے لیے کوشاں رہیں۔ اس فکر کے ساتھ رتن سنگھ کا رشتہ زندگی سے مزید گہرا ہو جاتا ہے۔ دراصل ان کے فکر و فن میں صوفیانہ عناصر کی شمولیت، ان کے بچپن کے ماحول و پرورش کی بدولت ہے۔ رتن سنگھ اپنے بچپن سے ہی کہانیاں پڑھنے اور سننے کے شوقین تھے۔ اسی شوق کو مزید جلا بخشی ان کی چھوٹی دادی نے۔ وہ اپنی چھوٹی دادی کی فرمائش پر ان کو صوفیانہ کلام سنایا کرتے تھے۔ جس میں پنجاب کے مقبول عشقیہ قصے بھی ہوتے تھے۔ لہذا بچپن سے ہی ان کو متعدد اچھے اشعار یاد ہو گئے تھے۔ یہ اثرات ان کے افسانوں میں بدرجہ اتم موجود ہیں جو معاصر افسانہ نگاروں میں ان کو منفرد بناتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۷۰ء میں رسالہ عصری ادب میں شامل اپنے ایک مضمون 'ساتویں دہائی کا افسانہ' میں رتن سنگھ کی انفرادیت کا اعتراف کرتے ہوئے محمد حسن لکھتے ہیں:

"تکنیک کی درجہ بندیوں سے قطع نظر اگر کوئی یہ سوال کرے کہ پچھلے دس سالوں کے اہم ترین افسانہ نگار کون ہیں۔ یعنی ایسے

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

افسانہ نگار جن کے افسانوں میں وہ لطیف تاثر اور نازک سی کیفیت پیدا کی ہو جو قاری کو نئی نظر دے سکے اور جمالیاتی ارتفاع فراہم کرے تو میرے نزدیک یہ لطیف کیفیت رتن سنگھ کے افسانوں میں جتنی ہے اتنی کسی اور کے یہاں کم ملے گی۔ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑی سچائیوں تک جو حوصلہ مشاہدہ کی گہرائی اور تاثر کی تیکھی، مرکوز اور مرتکز وحدت، قطرہ میں دجلہ دیکھنے والی نظر انھیں پچھلے دس برس میں ابھرنے والا سب سے اہم افسانہ نگار بناتی ہے۔"(16)

اس کے علاوہ رتن سنگھ کے افسانوں میں ماضی کی یادیں کثرت سے موجود ہیں۔ وہ ان کے نفسیاتی نشیب و فراز کی مظہر ہے۔ پنجرے کا آدمی، نافے کا درد، امانت کی چابھیاں، پناہ گاہ، ایک ہے بوڑھ، الفے سے آم، یوماسٹرو وغیرہ ایسے افسانے ہیں جن میں ان کا ماضی حال کی صورت میں موجود ہے۔ وہ ان افسانوں کے کرداروں کے ہمراہ زندگی کے تانے بانے تیار کرتے ہیں جن سے بچھڑے ان کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ لیکن یہ افراد ان کے خیالات میں زندہ اور متحرک ہیں۔ پرکھوں کی زمین سے اکھڑنے کا غم ان کے متعدد افسانوں میں تکرار کا باعث ہے ۔ جس سے رتن سنگھ کی فکری جہت محدود دائرہ کا شکار ہو کر فتنی صورتوں کو مجروح کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ غم ان کی زندگی کا المیہ ہے اور وہ اس کو عزیز رکھتے ہیں۔ لہذا اپنے اس نوسلجیا کا ذکر کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

"میرا انوسٹلجیا بیماری کی حد تک ہے میری بہت سی کہانیوں میں conciously اور بہت سی کہانیوں میں unconciously کسی نہ کسی طرح ضرور موجود ہے۔" (17)

ماضی کی یادوں سے اس حد تک جڑاؤ ہمیں رتن سنگھ کے معاصرین افسانہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتا۔ ہجرت کا کرب سہنے والے افسانہ نگاروں نے اس موضوع پر افسانے ضرور تخلیق کیے لیکن اس حد تک جذباتی وابستگی کے عناصر رتن سنگھ کے افسانوں کا خاص رنگ ہے۔

Al-Anfal
ISSN (Online): 3006-5208
ISSN (Print): 3006-5194
Name of Publisher: Al-Anfal
Education & Research
Vol. 2 No. 4 (2024)

حوالہ جات

1۔ نمائندہ اردو افسانے، مرتب قمر رئیس بھی: ۱۷۶، دہلی اکادمی ۱۹۹۶ء

2۔ رام معل 'چراغوں کا سفر، ۱۹۶۶ء ص: ۱۰

3۔ محمد حسن، ساتویں دہائی کا افسانہ، رسالہ عصری ادب، شمارہ ۶ دسمبر

4۔ جوگیندر پال، نیا اردو افسانہ عصری ادب، مدیر محمد حسن، دسمبر ۱۹۷۰، دہلی

5۔ تیسری آواز کا ادب، عصری ادب شمارہ ۳۹۔۴۰، اکتوبر، تا جنوری ۱۹۸۰، دہلی

6۔ عابد سہیل، سب سے چھوٹا غم، ص: ۲۴-۲۳، نصرت پبلشرز، ۱۹۷۵ء الکھنو

7۔ قیصر تمکین، آج کل ۱۹۶۳ بحوالہ سب سے چھوٹا غم، عابد سہیل، نصرت پبلشر لکھنو ۱۹۷۵ء

8۔ مشمولہ سب سے چھوٹا غم، عابد سہیل، دسمبر ۱۹۷۵ء، نصرت پبلشرز لکھنو

9۔ بحوالہ مہناز انور، اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، ص: ۱۳۴۹، نامی پریس لکھنو ۱۹۸۵ء

10۔ رسالہ عصری ادب، اقبال مجید، دو بھیگے ہوئے لوگ، دسمبر ۱۹۷۰ء ص: ۲۶۷

11۔ رسالہ الفاظ علی گڑھ، جنوری ۱۹۸۰ء ص: ۲۶

12۔ مہدی جعفر، تازہ منظر نامے، مشمولہ ایک حلفیہ بیان اقبال مجید، ص: ۱۵، ۱۹۸۴

13۔ بحوالہ رسالہ آج کل افسانہ نمبر، ص: ۶، ایڈیٹر خورشید اکرم، فروری ۲۰۰۹، دہلی

14۔ بحوالہ مہناز انور، اردو افسانے کا تنقیدی مطالعہ، ص ۱۹۸۵: ۳۹۴

15۔ رتن سنگھ، ذاتیات، عصری ادب، ص: ۱۰۷ ۱۰۸، شمارہ ۴، ۱۹۷۰، دہلی

16۔ محمد حسن، ساتویں دہائی کا افسانہ، رسالہ عصری ادب، دہلی، دسمبرہ ۱۹۷۰

17۔ رسالہ روشنائی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۱ ص: